خالی

ہم کب بڑے ہونگے؟

بچپن کے لفظ کے ساتھ بڑے ہلکے پھلکے تصورات ذہن میں آتے ہیں۔ مثلاً کھیلنا کودنا' کھانا پینا' کوئی فکر فاقہ نہ ہونا یا پھر پیار اور توجہ ملنا اور سب سے بڑھ کر ہر بچے کی ایک چھوٹی سی دنیا ہوتی ہے جو چند کھلونوں اور کارٹونوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ بچپن ایک ایسی معصوم کیفیت کا نام ہے جس میں یہ فکر نہیں ہوتی کہ کل کیا ہوگا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ حکومت کون کر رہا ہے یا پھر ہم اس دنیا میں کس لئے بھیجے گئے ہیں یا ہم کیا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہمارے بس میں ہو تو ہم بچپن کی پاکیزہ' خوبصورت اور پُرسکون کیفیت سے کبھی نہ نکلیں۔ اکثر لوگوں کو آپ نے یہ خواہش کرتے دیکھا ہوگا کہ کسی طرح بچپن واپس آجائے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا بچپن واقعی اتنا اچھا ہوتا ہے کہ ہم بچے ہی بنے رہیں؟ بچے جب معصوم حرکتیں کرتے ہیں تو بہت پیارے لگتے ہیں۔ اس سے تو کسی کو اختلاف نہیں ہے لیکن وہی حرکت اگر بڑے کرنے لگیں تو بیوقوف کہلاتے ہیں۔ آج کی بحث اِسی موضوع پر کی گئی ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ بچوں والی حرکتیں صرف بچوں پر ہی جچتی ہیں' وہ کون سی عادات ہیں جو صرف بچوں کے لئے ہی مناسب ہیں اور پھر یہ حد بندی کس طرح کی جائے کہ بچپن کہاں تک برداشت کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ادارے کی ریسرچ کے مطابق ہمارا معاشرہ بچپنے کا شکار ہے۔ جس طرح بچوں کے ذہن میں زندگی گزارنے کا کوئی مقصد واضح نہیں ہوتا اسی طرح ہمارے ہاں کے نوجوانوں میں بھی کوئی مقصدِ حیات نظر نہیں آتا۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل ہماری شخصیات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ بیشمار دوسرے مسائل کی طرح یہ بچپن بھی ہمارا ایک مسئلہ بن گیا ہے اور ہماری ترقی میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔

اگر ہم اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیں تو ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نظر آئے گی جو کام نہیں کرتے۔ اِن میں عورتیں' بچے' جوان سب شامل ہیں۔ عورتوں کے جو مسائل ہیں ان کی الگ سے ''عورتوں کی تعلیم یا پھر علم و آگہی'' کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ جبکہ بڑی عمر کے لوگوں کے مسائل'' Retirement کے بھوت'' کے حوالے سے زیرِ بحث آئیں گے۔ لیکن نوجوانوں کے مسئلے اور اُن کی سوچ سے لے کر اُن کے طرزِ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس آرٹیکل میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ نوجوان ہی معاشرے کا سب سے نمایاں طبقہ ہوتے ہیں۔ کسی قوم یا مذہب کے نوجوانوں کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ قوم کن افکار کو اپنائے ہوئے ہے اور ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ کسی معاشرے کے نوجوان ہی وہاں کی ترقی کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے معاشرے کے نوجوانوں کو دیکھیں تو اُن میں اور ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوانوں میں چند بنیادی فرق نظر آئیں گے جن میں سے ایک ماں باپ کے ساتھ رہنا ہے۔ اور دُکھ کی بات یہ ہے کہ لوگ اسے اسلام کے طرزِ عمل سے ملاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام جیسا Practical دین کس طرح ایسے طرزِ حیات کی حوصلہ افزائی کرسکتا ہے جس میں لوگ کاہل اور سست ہو جائیں۔ ہمارے ادارے کی ریسرچ کے مطابق جو دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اُس کے مطابق ہمارے ہاں بچے ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں چاہے وہ چالیس' پینتالیس سال کے ہو جائیں۔ اُن کی شادیاں ماں باپ کرتے ہیں۔ انھیں ماں باپ اپنے گھر میں رکھتے ہیں کیونکہ اُنکا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ بجائے اس کے کہ اولاد ماں باپ کے لئے کچھ کرسکے ماں باپ بچوں کو بڑھاپے تک پال رہے ہوتے ہیں۔ جس ملک میں اوسط عمر عورتوں میں ۴۵ اور مردوں میں ۵۰ ہو وہاں بچے اگر تیس سال تک بڑے ہی نہ ہوسکیں تو اُن کو تو اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوتے ہی زندگی کا وقت ختم ہو جائے گا۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں یہ مسئلہ تقریباً ہر گھر کا ہو کیا ترقی کرسکے گا؟ ہمارے ہاں کا غریب طبقہ جس میں چھوٹے بچوں سے محنت مزدوری کروائی جاتی ہے اُن کو ہم اس لئے بڑوں میں شامل نہیں کرسکتے کیونکہ اس طرح کمانے میں بچوں کی مرضی یا پھر کمائے ہوئے پیسوں میں بچوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس طرح کے کام کو جبراً مشقت (Forced child labour) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح کاروباری طبقہ جس میں باپ' دادا کا کاروبار نسل در نسل چلتا ہے۔ اس طبقے کا طریقہ کار کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ باپ کی دوکان پر بیٹے کو بیٹھنا ہوتا ہے جس وجہ سے بیٹا چاہے ڈاکٹر یا انجینئر بن کر زندگی گزارنا پسند کرے تب بھی اُس کے لئے کافی مشکل ہوتی ہے۔ اکثر اوقات ایسے بچے اپنے اردگرد کے حالات کے پیشِ نظر کاروبار ہی سنبھالنا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاروباری طبقے میں تعلیم حاصل کرنے کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تعلیم حاصل کرنا پیسے کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔

جب کسی انسان کو آزادی نہ دی جائے چاہے یہ آزادی کچھ سوچنے کی ہو یا عمل کرنے کی ہو اور اس سے بچوں کا سا سلوک کیا جائے تو وہ بڑوں میں کیسے شامل ہوگا چاہے اُس کی عمر ۲۰ سال ہو یا ۴۰۔ ایسے ہی حالات مشترکہ خاندانی نظام کے تحت بھی دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہ بہت سے لوگوں کے ساتھ رہنے کی وجہ

سے کسی کو بھی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرنے اور انفرادی سوچ رکھنے کی آزادی نہیں ہوتی۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اِس طرح کے طرزِ زندگی کے کیا اثرات ہیں جو ہماری انفرادی اور اجتماعی ترقی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ ماں' باپ بچوں کو کس پیار سے پالتے ہیں اور اُن بچوں کو یقیناً خوش قسمت سمجھا جاتا ہے جنھیں ماں' باپ کا پیار میسر ہو۔ لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ پیار بعض اوقات بچوں کی تربیت میں بُری طرح حائل ہوتا ہے جس کے نتائج بچوں کے بڑے ہونے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ اصل پیار تو وہی ہونا چاہیے جو بچوں کو عملی زندگی اچھی طرح گزرنے کے قابل بنا سکے۔ جبکہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ہاں علم اور سمجھ بوجھ کی کمی کے پیشِ نظر بچوں کی تربیت کی ہی نہیں جاتی جس کی وجہ یہ ہے کہ نسل در نسل غلط اقدار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غلط طرزِ زندگی منتقل ہو رہی ہے۔ بچے کس کو پیارے نہیں ہوتے لیکن کیا ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں (خدانخواستہ) اپنے بچوں سے اللہ تعالیٰ کی نسبت زیادہ محبت ہے؟ جبکہ ایک حدیث شریف کے مطابق اللہ تعالیٰ ہم سے ہماری ماؤں سے ستر گناہ زیادہ محبت کرتا ہے۔ تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو اصول ہم اپنے بچوں کے لئے بناتے ہیں وہ خدانخواستہ اللہ کے بنائے ہوئے اصولوں سے بہتر ہیں۔ ایک عام مثال نماز کی ہے۔ ہم میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنے دس سال کے بچے کو نماز پڑھنے کے لئے سختی سے کہیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تو نماز کے لئے سات سال کی عمر سے کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح کی بے شمار غلط فہمیوں اور فرسودہ سوچ کے زیرِ اثر جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو ہم اُن سے یہ اُمید کیسے لگا سکتے ہیں کہ وہ عملی زندگی میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اِسی طرح کی غلط تربیت کی وجہ سے ہم ایک ایسی قوم بن چکے ہیں جسکے نوجوان مغرب اور مشرق کی بے شمار برائیاں اپنے وجود کے اندر سموئے ہوئے ہیں اور ایک **Confused** اور عزتِ نفس سے خالی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال اُس خاتون کی ہے جو ہمارے ادارے میں بڑی پریشان حالت میں آئیں۔ اُنکا مسئلہ کچھ یوں تھا کہ اُنکا خاوند اُن کی بات بالکل نہیں سنتا تھا بلکہ ماں باپ کے کنٹرول میں ہے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ وہ صاحب کرتے کیا ہیں تو جواب کچھ ایسے تھا کہ انھیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ پیسوں کا نہیں بلکہ آپس میں **Understanding** کا ہے۔ خاتون کے مسائل سن کر اندازہ ہوا کہ شادی بھی اِسی بنیاد پر کی گئی تھی کہ لڑکے کا باپ کسی اچھی پوزیشن پر کام کر رہا ہے۔ گھر بھی بہت بڑا ہے اور کیا چاہیے! شاید کچھ کمی تھی تو وہ عقل سے کام لینے کی تھی۔ جن لوگوں نے اپنے

بیٹے کی ایسی تربیت کی ہو کہ وہ کچھ کرنے کے قابل نہ ہو بلکہ تیس سال کی عمر میں بھی ماں باپ کے سر پر پڑا ہو تو وہ تو یقیناً بڑا ہوا ہی نہیں۔ بچوں سے تو یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ اچھے بچے ہمیشہ ماں باپ کا ہی کہنا مانتے ہیں لیکن یہ تو شادی کے وقت لڑکی اور اُسکے ماں' باپ کو دیکھنا چاہیے کہ رشتہ لڑکے کو دیکھ کر کریں تا کہ باپ کی حیثیت اور گھر دیکھ کر غلط فیصلے تو غلط نتائج کے ہی حامل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں شادی ہونا زندگی ختم ہونے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یعنی شادی کے ساتھ ہی تمام حقائق کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ واپسی کا کوئی راستہ تو ہوتا ہی نہیں۔ ہمارے معاشرے کی اقدار اجازت نہیں دیتیں کہ حالات خراب ہونے کی صورت میں کچھ کیا جا سکے۔ اِن حالات کی بھی زیادہ تر وجہ یہی ہوتی ہے کہ شادی چونکہ ماں' باپ کی مرضی سے خاندانی مفادات کے تحت کی جاتی ہے۔ لہٰذا ماں' باپ ہی بچوں کو مجبور کرتے ہیں کہ خاندان میں ناک کٹنے سے بہتر ہے جیسے تیسے زندگی گزار لی جائے۔ ہمارے ادارے نے حال ہی میں ایک ٹریننگ کورس کا اہتمام کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانوں کو یہ آگاہی دی جائے کہ شادی کرتے ہوئے کیا کیا دیکھنا چاہیے۔ جو لوگ اس کورس میں شامل ہوئے تقریباً سبھی ماں' باپ سے چھپ کر یا جھوٹ بول کر آئے تھے کیونکہ اُن کے ماں' باپ اس کورس کی مخالفت کر رہے تھے۔ اندازہ لگایئے کہ ماں' باپ خود ہی بچوں کو علم نہیں دینا چاہتے کیونکہ پھر یہ بچے نہیں رہیں گے بلکہ اپنے فیصلے خود کرنے لگیں گے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ماں' باپ بچوں کو بڑا نہیں ہونے دیتے کیونکہ وہ اُن کے کنٹرول سے نہ نکل جائیں گے اور ہمارے ماں باپ بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہیں۔ جب تک ایک بچہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے ماں' باپ پر انحصار کرتا ہے تو اُس کو پیار اور تحفظ کا احساس رہتا ہے اور اس طرح وہ اپنا بچپن اپنے مستقبل کی تیاری میں گزارتا ہے لیکن جب ایک بالغ **(Adult)** یہی سب کچھ کرے تو اُس کا کیا مستقبل ہوگا۔ یہی ہمارے اردگرد ہو رہا ہے۔ نوجوانوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہے کیونکہ ذمہ داری اُن پر ڈالی ہی نہیں جاتی۔ وہ زندگی گزارنا سیکھ ہی نہیں سکتے۔ اِسی لئے عملی زندگی میں بُری طرح ناکامی کا سامنا کرتے ہیں۔ معاملہ شادی کا ہو یا نوکری کا ہر صورت میں یہ بچے ماں' باپ کا منہ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ غور کریں جس دھوم دھام سے ہمارے ہاں شادیاں کی جاتی ہیں کیا ایک نوجوان کے لئے ممکن ہے کہ ایک اچھی صاف ستھری زندگی گزارنے کے لئے یہ سب کر سکے؟ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر بچے ماں' باپ کو خرچ کرنے سے روکیں تو ماں' باپ یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ تم سے تو کچھ نہیں مانگ رہے خود ہی کر رہے ہیں۔ ہماری خوشی اِسی میں ہے کہ خاندان میں نام ہو لہٰذا تم شادی دھوم دھام سے

کرنے دو۔ تم اپنا کام کرو اور اچھے اور فرمانبردار بچے بنے رہو۔

اس گھمبیر صورتِ حال سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی زندگی کی ذمہ داری خود اُٹھائیں۔ کوئی مذہب بھی اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ماں' باپ کی وہ بات مانی جائے جو خدائی احکامات کی خلاف ورزی کی طرف مائل کرنا چاہے۔ ماں' باپ جو بھی کہیں نوجوانوں کو سمجھنا چاہیے کہ یہ اُن کی زندگی ہے اور اُس کے فیصلے اُن کو خود ہی کرنے ہیں۔ ہمارا دین اسلام تو ہمیں اپنی زندگی کی ذمہ داری خود ہی اُٹھانے کی ترغیب دیتا ہے۔ جلد شادی کرنا' سادگی اختیار کرنا' محنت کرنا' اپنے فیصلے علم کی بنیاد پر کرنا اور کسی بھی نقصان کا ذمہ دار کسی دوسرے کو نہ ٹھہرانا ہمارے دین کے بنیادی اصول ہیں۔ غور کریں تو یہ سب ہمیں ایک ایسی زندگی کی طرف راغب کرتے ہیں جو کسی بھی انسان کو کامیابی کی آخری حدوں تک لے جا سکتی ہے۔ لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تو اُس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارے ہاں کسی کو بھی ذمہ داری کا احساس نہیں ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ احساس کیسے پیدا کیا جائے جبکہ آج دنیا میں جتنے کامیاب لوگ ہیں اُن میں سے ۹۹ فیصد ایسے لوگ ہیں جنہوں نے کسی کی مدد کے بغیر یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اِن میں سے زیادہ تر لوگوں کا تعلق مغرب سے ہے۔ جب ہم مغربی کلچر کی بات کرتے ہیں تو صرف اُن کی بُرائیاں دیکھتے ہیں جبکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر مغرب کی ترقی کی بنیاد بُرائی ہی ہے تو پھر اس سے تو یہ نتیجہ نکلا کہ بُرے لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ قانونِ قدرت کے خلاف ہوگا۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اُن کی کون سی ایسی عادات ہیں جو اُن کی ترقی میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ آج کے موضوع کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ وہاں کے بچے کس طرح کی تربیت لے کر جوان ہوتے ہیں۔ نفسیات کا ایک اصول ہے کہ آپ کسی کو جس طرح مخاطب کرتے ہیں وہ اُسی طرح بن جاتا ہے۔ اسی اصول کو اپناتے ہوئے مغرب کے ترقی یافتہ لوگ اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں۔ بچوں کو شروع سے اپنے کام خود کرنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ چونکہ وہاں لوگ زیادہ تر کام خود کرتے ہیں اس لئے بچوں کی پرورش اس طرز پر کی جاتی ہے کہ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات جیسے کپڑے بدلنا' کھانا وغیرہ ہوم ورک کر لینا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ لہٰذا انھیں ان کاموں کے لئے ماں' باپ کا انتظار نہیں کرنا پڑتا جبکہ یہاں صورتِ حال مختلف ہے۔ لوگ اپنا کام خود کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا بچوں میں بھی کام کرنے کی عادت نہیں ڈالی جاتی۔ بعض گھروں میں صورتِ حال کچھ اس طرح کی ہے کہ ہر بچے کے لئے ایک آیا ہوتی ہے یہی حال ہمارے ہاں

نوجوانوں کا ہے۔ جو لڑکے اپنا بچپن نوکروں کے ساتھ گزارتے ہیں جب بڑے ہو کر انھیں وہ سہولیات میسر نہیں ہوتیں تو وہ گھر کی خواتین کو نوکر بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں مرد حضرات گھر کے کام کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ نوکری کے سلسلے میں بھی انھیں کافی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ انھیں کام کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔ ماں، باپ کے پیسوں پر عیش کرتے ہیں اور اس طرح فضول خرچ بن جاتے ہیں۔ اگر ہم اسلام کے اصولوں کے پابند رہ کر بچوں کی تربیت کریں تو ان سب قباحتوں سے بچ سکتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر ہر ماں اپنے بچے کو یہ سیکھا سکے کہ لڑنا نہیں ہے تو دنیا میں جنگیں بند ہو جاتیں۔ کیونکہ جنگیں بھی قابلیت سے جیتی جا سکتی ہیں۔ تو ہم اپنے بچوں کو زندگی اچھے طریقے سے گزارنا کیوں نہیں سکھا سکتے۔

آج ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ جو لوگ علم یافتہ ہیں اور اللہ کے بتائے ہوئے قوانین پر یقین رکھتے ہیں اُن کے لئے تو اِس سارے مسئلہ کا حل قرآن پاک میں موجود ہے۔ جس میں یہ صاف بتا دیا گیا ہے کہ اولاد سے محبت اللہ کے حکم سے بڑھ کر نہیں ہے جب حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیں اور سوال بھی نہ کریں تو یہ پوری انسانیت کے لئے سبق تھا کہ ہماری اولاد اللہ کی امانت ہے۔ اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی ضروری ہے چاہے ہمیں اُس کے لئے کچھ بھی قربان کرنا پڑے۔ قوانینِ قدرت ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ اولاد سے محبت کے دھوکہ میں ہم ایسے اقدام اُٹھائیں جو آگے چل کر بچوں کی زندگی مشکل بنا دیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ ماں، باپ کو بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ اُن کو کچھ بتانے میں عزت و احترام کا مسئلہ آڑے آ جاتا ہے۔ جو علم یافتہ لوگ ہیں انھیں اپنے آپ کو ہمیشہ سیکھنے کے لئے **Flexible** بنانا چاہیے کہ وہ زندگی کے کسی بھی حصے میں ہوں وہ ہمیشہ نئی اور اچھی بات سیکھتے رہیں لیکن بدقسمتی سے ایسا ہوتا نہیں ہے۔ عزتِ نفس کی کمی کی وجہ سے ہمارے ہاں لوگ کسی سے کچھ سیکھنے سے بہت کتراتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا ہوگا جو نسبتاً آسان ہو۔ وہ راستہ یہی ہے کہ نوجوان خود اپنی ذمہ داری اٹھائیں۔ مغربی معاشرے میں یہ رواج ہے کہ بچوں کو بہت جلد گھر سے نکال دیا جاتا ہے اگر نکالا نہ جائے تو وہ خود نکل جاتے ہیں۔ چودہ، پندرہ سال کی عمر میں گھر سے قدم نکال کر وہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے پانچ چھ سال کے اندر اندر بہت کچھ سیکھ چکے ہوتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں بیس سال کا نوجوان اِن ٹھوکروں سے تو بچ جاتا ہے لیکن باقی ساری عمر ٹھوکریں ہی کھاتا ہے۔ مغربی معاشرے کے پاس اپنی اولاد کو دینے کے لئے

بہت کچھ نہیں ہے لیکن وہ چند ضروری چیزیں یعنی اپنی ذات پر اعتماد، محنت کی عادت اور کچھ نہ کچھ اچھے بُرے کی تمیز (جو یقیناً اُن کی اپنی اقدار کے مطابق ہوتی ہے) دے کر بچے کو آزاد کر دیتے ہیں۔ نتائج ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں معاشرے میں بچوں کو نہ اچھی اقدار سکھائی جاتی ہیں نہ ہی اُن میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ جانتے ہوئے ماں، باپ انھیں اپنے پروں کے نیچے بیٹھائے رکھتے ہیں اور اس کے نتائج کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ:

> ”اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی اور پھر اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔“ (النجم :۳۹-۴۱)

ہمارے ہاں کتنے ایسے گھر ہیں جن میں کمانے میں صرف ایک یا دو افراد حصہ لیتے ہیں لیکن بہت سے بے کار لوگ بھی اُسی گھر میں رہ رہے ہوتے ہیں۔ ماں، باپ محبت سے مجبور ہو کر اپنی اولاد کو پال رہے ہیں لیکن اُس گھر میں رہنے والے باقی لوگوں کا کیا قصور ہے۔ کسی کے نکما یا بے کار ہونے کی سزا صرف اُسی کو ملنی چاہیے نہ کہ سارے خاندان کو۔ اس مسئلے کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہم نے ایک ایسی نسل پیدا کر دی ہے جو ماں، باپ پر اس حد تک انحصار کرتی ہے کہ اپنی صلاحیتوں پر غور کرنے کی بھی مجاز نہیں ہے۔ لاہور کے ایک بہت بڑے سکول کا واقعہ پیشِ خدمت ہے جس سے صورتِ حال واضح ہوتی ہے۔ آٹھویں کلاس کے دو بچے آپس میں لڑ پڑے جب ٹیچر معاملہ سلجھانے پہنچے تو ایک بچہ دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ تم دس مرلے کے گھر میں رہنے والوں سے تو میں بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ جو بچہ یہ کہہ رہا تھا وہ ایک ایسے انسان کا بیٹا تھا جس نے حرام اور ناجائز طریقوں سے اس ملک کو خوب لوٹا اور اس طرح اپنی اولاد کو یہی سوچ دے سکا ہے۔ اِس طرح والدین کتنے ہی بچوں کے ذہنوں کو تباہ کر کے اس ملک کو اس طرح کے ناسور دے رہے ہیں۔ یقیناً صاف دکھائی دے رہا ہے کہ تباہی اس بچے کا مقدر ہے اور اس کے ماں، باپ شاید اس غلط فہمی میں ہیں کہ وہ اپنی اولاد کو بہت کچھ دے رہے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کیونکہ یہ طریقہ کار بچوں کی تربیت کے لئے کائنات بنانے والے کے اصولوں کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا کہ ماں، باپ کی سوچ بدلنے کی بجائے ہمارے نوجوانوں کو پہلا قدم اٹھانا ہوگا اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کر کے اپنی زندگی کی ذمہ داری خود اُٹھانا ہوگی۔

خالی